مسلکِ اعتدال

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

مسلک اعتدال

کسی مسلمان کو اس بات سے انکار نہیں ہو سکتا کہ امور دین میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا قول و عمل واجب الاتباع ہے اور قرآن کے بعد جس چیز کے ذریعہ سے ہم کو اپنے دین کا علم حاصل ہوتا ہے وہ حضور کا طریقہ ہی ہے۔ اس کے بعد سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ طریق نبوی کے علم کی کیا کیا صورتیں ہیں اور کس صورت کا دین میں کیا مرتبہ ہے۔

جو باتیں حضورؐ سے ہم تک پہنچی ہیں ان کو دو حصوں پر تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ حصہ ہے جو تواتر کے ساتھ آیا ہے' خواہ وہ تواتر عملی ہو یا خبری دوسرا حصہ وہ ہے جو تواتر کے ساتھ نہیں آیا۔ ان میں سے پہلے حصے کے متعلق تمام امت کا اتفاق ہے کہ وہ یقینی ہے اور عقل بھی یہ فیصلہ کرتی ہے کہ اسے ثابت شدہ حقیقت تسلیم کرنا چاہیے کیوں کہ تواتر کا مفید یقین ہونا مسلمات میں سے ہے۔ رہا دوسرا حصہ تو اصولاً" اس کو سب ظنی مانتے ہیں۔ کوئی بھی یہ نہیں کہتا کہ وہ مفید علم ضروری ہے۔ مگر اختلاف جو کچھ واقع ہوتا ہے وہ اس امر میں ہے کہ اس اصولی ظنیت کی بنا پر اخبار آحاد کے ساتھ کیا معاملہ

کیا جائے؟اس مسئلے میں تین مختلف مسلک ہیں۔

ایک گروہ کہتا ہے کہ احادیث کا تمام مجموعہ ظنی ہے' اس لیے وہ من حیث الکل رد کردینے کے لائق ہے' کیوں کہ جو چیز ظنی ہے وہ ثابت شدہ نہیں اور جو ثابت شدہ نہیں وہ لائق اتباع نہیں۔ مگر تھوڑے سے غورو خوض کے بعد اس مسلک کی غلطی واضح ہوجاتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کوئی **مظنون** چیز **ثابت** شدہ نہیں ہوتی لیکن کسی چیز کا **ثابت** شدہ نہ ہونا یہ معنی کب رکھتا ہے کہ وہ رد ہی کردینے کے قابل ہو؟ اگر اتباع کے لیے یقینی ہونا شرط ہے تو فرمائیے کہ "**یقینیات**" دنیا میں ہیں کتنے؟ آپ کی زندگی کے کتنے معاملات ایسے ہیں جن میں آپ صرف **یقینیات** کی پیروی کرتے ہیں اور **مظنونات** کو من حیث الکل رد کردیتے ہیں؟ تجزیہ و تحلیل کے چند ہی مدارج طے کرکے آپ کو معلوم ہوجائے گا کہ یہ قاعدہ زندگی میں نہ کبھی چلا ہے نہ چل سکتا ہے۔ **مظنونات** کو من حیث الکل قبول کرلینا جس درجے کی غلطی ہے' اسی درجے کی غلطی ان کو من حیث الکل رد کردینا بھی ہے۔ عقل سلیم کا اقتضا یہ ہے اور اسی کی پیروی زندگی کے تمام معاملات میں انسان کرتا ہے کہ تمام **مظنونات** کو ایک ہی لکڑی سے نہ ہانکا جائے بلکہ ان کے درمیان تمیز کی جائے۔ ان میں سے ہر ایک کو جدا جدا جانچ کر دیکھا جائے اور تحقیق کے مختلف ذرائع

سے کام لے کر یہ دریافت کیا جائے کہ کون سی چیز یقین سے کس درجہ قریب یا کس درجہ بعید ہے۔ جو چیز بعید ہو اسے رد کردو' جو چیز قرب و بعد کے درمیان ہو اس میں توقف کرو اور جو چیز قریب یا اقرب ہو اس کو بہ لحاظ اس کے درجے کے قبول کرلو۔ یہی اصول ہے جس پر دنیا کے سارے معاملات میں عمل کیا جاتا ہے۔ اور چوں کہ ہمارا دین غیر معقول نہیں ہے اس لیے اس کی پیروی دین کے معاملات میں بھی کرنی چاہیے۔ کم از کم ہمیں تو قرآن میں کوئی ایک آیت بھی ایسی نہیں ملی جو اس اصول کو خلاف حق قرار دیتی ہو۔ جن آیات میں ظن پر چلنے والوں کی برائی وارد ہوئی ہے ان کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ظن کوئی گناہ ہے یا اس سے بالکلیہ اجتناب واجب ہے' بلکہ اس کا منشاء صرف یہ ہے کہ جو ظن و تخمین وحی کے خلاف ہو' یا جس کو وحی سے بے نیاز اور بے پرواہو کر اختیار کیا جائے' وہ گمراہی کا سبب ہے۔

احادیث کو بالکلیہ رد کردینے سے عملاً جو خرابی واقع ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ جزئیات میں انسان رسالت کی رہنمائی سے محروم ہو جاتا ہے' اور دین پر عمل کرنے کی تفصیلی صورتوں میں قیاس و رائے کا دخل اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ اس سے اصولی احکام کی اصل اسپرٹ کے بھی ضائع ہو جانے کا خوف ہے۔ نیز اس میں یہ بھی خطرہ ہے کہ جب تفصیلات میں سرے سے کوئی سند ہی نہ ہوگی تو لامحالہ انفرادیت

راہ پائے گی۔ ہر شخص اپنی رائے اور اپنے رجحان کے مطابق جو صورت چاہے گا اختیار کرے گا اور کوئی قوت ایسی باقی نہ رہے گی جو تفرقہ و انتشار اور اختلاف عمل کو انفرادیت کی آخری حدود تک پہنچنے سے روک سکتی ہو۔ مثال کے طور پر ایک نماز جمعہ ہی کو لیجیے۔ ہمارے پاس علم یقین کے جو ذرائع ہیں ان میں سے پہلا اور سب سے بڑا ذریعہ یعنی قرآن ہم کو صرف یہ ہدایت دیتا ہے کہ "جب نماز جمعہ کے لیے بلایا جائے تو سب کام چھوڑ کر دوڑ پڑو۔" دوسرا ذریعہ یعنی عمل متواتر ہم کو اس سے تھوڑی دور آگے لے جاکر چھوڑ دیتا ہے۔ وہ صرف اتنا علم ہم کو دیتا ہے کہ جمعے کا وقت ظہر کا وقت ہے' اس کے لیے جماعت شرط ہے' اس سے پہلے خطبہ ہونا چاہیے' اس کی رکعتیں دو ہیں اور اس کے لیے اذن عام ضروری ہے۔ ان امور کے بعد جتنے عملی جزئیات ہیں ان میں سے کوئی چیز بھی قرآن یا عمل متواتر سے ہم کو معلوم نہیں ہوتی۔ اب اگر اخبار آحاد کو بہ حیثیت مجموعی رد کردینے کا اصول اختیار کیا جائے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر شخص جزئیات کو اپنی رائے سے مقرر کرے گا اور کسی رائے کو بھی کوئی ایسی قوت حاصل نہ ہوگی جس کی بنا پر اسے دوسری رائے کے مقابلہ میں ترجیح دی جاسکے اور مسلمانوں کی کسی بڑی جماعت پر اس کی پیروی لازم ہوجائے۔ آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ اس سے جزئیات میں کتنی افرا

تفری برپا ہوگی' نظام جماعت کو کتنا نقصان پہنچے گا اور کس طرح بعض صورتوں میں مقاصد شریعت تک فوت ہوجائیں گے۔ اس میں شک نہیں کہ اخبار احاد سے جو تفصیلات معلوم ہوئی ہیں وہ بھی کچھ نہ کچھ مختلف ہیں اور ان کی بنا پر بھی متعدد مذہب نکلتے ہیں۔ مگر اول تو ان میں بہ مشکل پانچ سات مذاہب نکلنے کی گنجائش ہے اور پھر ان سے جتنے مذہب بھی نکلتے ہیں ان میں سے ہر ایک کو اسی ایک بالاتر اقتدار کی سند حاصل ہے جس کو سب مسلمان تسلیم کرتے ہیں اور جس کی قوت سے مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت اس کا اتباع کرتی ہے بہ خلاف اس کے اخبار احاد کو بالکلیہ رد کردینے کے بعد بے شمار مذاہب کی گنجائش نکل آتی ہے اور ان میں سے کسی مذہب کو بھی کوئی ایسی سند حاصل نہیں ہوتی جو زیادہ نہیں دو ہی مسلمانوں کو ایک جزئیہ میں ایک طریقے پر جمع کردے۔ نتیجہ اس کا بالکل ظاہر ہے' جمعہ کی قوت جامعہ ختم ہوکر رہ جائے گی' اختلاف عمل اس مقصد ہی کا خاتمہ کردے گا جس کے لیے اقامت جمعہ فرض کی گئی ہے۔

جمعہ کو ہم نے صرف مثال کے طور پر پیش کیا ہے۔ ورنہ اگر آپ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اسلام کے نظام شرعی کو جو چیز ایک مستقل عملی نظام بناتی ہے اور جو چیز مسلمانوں کی تہذیب' تمدن' معاشرت' معیشت' سیاست غرض ان کی پوری اجتماعی زندگی اور

انفرادی برتاؤ کو ایک مستقل تفصیلی شکل میں ڈھالتی ہے' وہ وہی علم ہے جو ہم کو اخبار احاد سے ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پبلک اور پرائیوٹ زندگی' آپ کے اخلاق' آپ کی عادات' آپ کا طریق عبادت' آپ کا طرز تعلیم و تبلیغ' آپ کا طرز عدالت' آپ کے قانونی فیصلے' زندگی کے مختلف شعبوں میں آپ کی ہدایات اور آپ کا طرز عمل' پھر آپ کے خلفاء' صحابہ اور اہل بیت اور تابعین کے آثار۔ یہی وہ چیزیں ہیں جو اسلام کی عملی زندگی کا پورا نقشہ پیش کرتی ہیں اور اسی نقشے پر اسلام ایک مکمل نظام حیات بنتا ہے۔ مگر ان چیزوں کے حصول کا ذریعہ نہ قرآن ہے نہ تواتر۔ صرف اخبار آحاد ہی ہیں جو ہم تک معلومات اور ہدایات کا یہ عظیم الشان ذخیرہ پہنچاتی ہیں۔ ان کو مٹا دیجیے۔ پھر اسلام محض ایک ڈھانچہ رہ جائے گا جس پر گوشت پوست کچھ نہ ہوگا جس کی شکل اور جس کے خدوخال کو جو شخص جس طرح چاہے گا بنائے گا۔ اس صورت میں درحقیقت کوئی ایک نظام جماعت قائم ہی نہ ہو سکے گا کجا کہ کوئی ایسی تہذیب وجود میں آسکے جو اسلامی تہذیب ہو۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث کی مخالفت آج وہی لوگ کر رہے ہیں جو دراصل اسلامی تہذیب کے نظام کو توڑنا چاہتے ہیں۔ وہ اس کے تعینات کی حدود میں اپنی اہواء اور خواہشات کی پیروی کے لیے گنجائش نہیں پاتے' اس لیے انہوں نے یہ مسلک

اختیار کیا ہے کہ اس چیز کو ہی مٹادو جو اس نظام کی حد بندی کرتی ہے' پھر ہم آزاد ہو جائیں گے کہ اسلام کے ڈھانچے پر جس طرح چاہیں گوشت پوست چڑھائیں اور جیسی چاہیں اس کی شکل بنا دیں۔

یہ لوگ احادیث کو مجموعی حیثیت سے مردود قرار دینے کے لیے ان حدیثوں کو مثال میں پیش کرتے ہیں جو باہم متعارض ہیں' یا جن میں انبیاء علیہم السلام پر طعن پایا جاتا ہے' یا جو صریح عقل کے خلاف ہیں' یا قرآن کے خلاف نظر آتی ہیں۔ ان چند افراد سے یہ لوگ پورے مجموعے کے غلط اور قابل رد ہونے پر استدلال کرتے ہیں۔ مگر یہ استدلال ایسا ہی ہے جیسے کسی قوم کے چند افراد کی بدمعاشی سے پوری قوم کی بدمعاشی پر استدلال کیا جائے۔ جب ہر روایت بہ لحاظ متن اور بہ لحاظ اسناد دوسری روایت سے مختلف ہے تو ہر روایت کے متعلق جدا جدا تحقیق کر کے رائے قائم کرنی چاہیے کہ وہ قبول کرنے کے لائق ہے یا رد کر دینے کے لائق۔ سب کو ایک مجموعہ کی حیثیت سے لے کر پورے مجموعے کے متعلق ایک ہی رائے قائم کر لینا کسی معقول انسان کا فعل نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ لوگ احادیث پر "فرداً فرداً" نگاہ ڈالیں گے تو ان کو معلوم ہو گا کہ جہاں ایک قلیل تعداد ایسی حدیثوں کی ہے جنہیں دیکھ کر دل گواہی دیتا ہے کہ یہ حدیثیں رسول اللہؐ کی نہیں ہو سکتیں' وہاں ایک کثیر تعداد ایسی

حدیثوں کی بھی ہے جو حکمت کے جواہر سے لبریز ہیں' جن میں قانون اور اخلاق کے بہترین اصول پائے جاتے ہیں' جو اسلام کی حقیقت اور اس کے مصالح و حکم پر بہترین روشنی ڈالتی ہیں اور جن کو دیکھ کر دل گواہی دیتا ہے کہ یہ ایک رسول ہی کی حدیثیں ہو سکتی ہیں پھر اگر یہ لوگ حق پرست اور انصاف پسند ہوں تو انہیں نظر آئے کہ محدثین کرام نے عہد رسالت اور عہد صحابہ کے آثار و اخبار جمع کرنے' ان کو چھانٹنے اور ان کی حفاظت کرنے میں وہ محنتیں کی ہیں جو دنیا کے کسی گروہ نے کسی دور کے حالات کے لیے نہیں کیں۔ انہوں نے احادیث کی تنقید و تنقیح کے لیے جو طریقے اختیار کیے وہ ایسے ہیں کہ کسی دور گزشتہ کے حالات کی تحقیق کے ان سے بہتر طریقے عقل انسانی نے آج تک دریافت نہیں کیے۔ تحقیق کے زیادہ سے زیادہ معتبر ذرائع جو انسان کے امکان میں ہیں وہ سب اس گروہ نے استعمال کیے ہیں اور ایسی سختی کے ساتھ استعمال کیے ہیں کہ کسی دور تاریخ میں ان کی نظیر نہیں ملتی۔ درحقیقت یہی چیز اس امر کا یقین دلاتی ہے کہ اس عظیم الشان خدمت میں اللہ تعالیٰ ہی کی توفیق شامل حال رہی ہے' اور جس خدا نے اپنی آخری کتاب کی حفاظت کا غیر معمولی انتظام کیا ہے' اسی نے اپنے آخری نبیؐ کے نقوش قدم اور آثار ہدایت کی حفاظت کے لیے بھی وہ انتظام کیا ہے جو اپنی نظیر آپ ہی

ہے۔

یہ تو اس گروہ کے متعلق تھا جو احادیث کی اصولی ظنیت کی بنا پر انہیں بالکلیہ رد کردینا چاہتا ہے۔ اب دوسرے گروہ کو لیجیے جو دوسری انتہا کی طرف چلا گیا ہے۔ یہ لوگ محدثین کے اتباع میں جائز حد سے بہت زیادہ تشدد اختیار کرتے ہیں۔ ان کا قول یہ ہے کہ محدثین کرام نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کرکے رکھ دیا ہے ایک ایک حدیث کو چھانٹ کر وہ بتا چکے ہیں کہ کون کس حد تک قابل اعتبار ہے اور کون کس حد تک ناقابل اعتبار۔ اب ہمارا کام صرف یہ ہے کہ ان بزرگوں نے احادیث کے جو درجے مقرر کردیے ہیں انہی کے مطابق ہم ان کو اعتبار اور حجیت کا مرتبہ دیں۔ مثلاً جو قوی الاسناد ہے اس کے مقابلے میں ضعیف الاسناد کو چھوڑ دیں جسے وہ صحیح قرار دے گئے ہیں اسے صحیح تسلیم کریں اور جس کی صحت میں وہ قدح کرگئے ہیں اس سے بالکل استناد نہ کریں۔ ان کے معروف کو معروف اور ان کے منکر کو منکر مانیں۔ رواۃ کے عدل اور ضبط اور ثقاہت کے متعلق جن جن آراء کا وہ اظہار کرگئے ہیں ان پر گویا ایمان لے آئیں' ان کی نگاہ میں احادیث کے معتبر یا غیر معتبر ہونے کا جو معیار ہے ٹھیک اسی معیار کی ہم بھی پابندی کریں۔ مثلاً مشہور کو شاذ پر' مرفوع کو مرسل پر' مسلسل کو منقطع پر لازماً" ترجیح دیں اور ان کی

کھینچی ہوئی حد سے یک سر مو تجاوز نہ کریں۔ یہی وہ مسلک ہے جس کی شدت نے بہت سے کم علم لوگوں کو حدیث کی کلی مخالفت یعنی دوسری انتہا کی طرف دھکیل دیا ہے۔

محدثین رحمہم اللہ کی خدمات مسلم۔ یہ بھی مسلم کہ نقد حدیث کے لیے جو مواد انہوں نے فراہم کیا ہے' وہ صدر اول کے اخبار و آثار کی تحقیق میں بہت کار آمد ہے' کلام اس میں نہیں' بلکہ صرف اس امر میں ہے کہ کلیتہ" ان پر اعتماد کرنا کہاں تک درست ہے۔ وہ بہرحال تھے تو انسان ہی۔ انسانی علم کے لیے جو حدیں فطرۃ" اللہ نے مقرر کر رکھی ہیں ان سے آگے تو وہ نہیں جاسکتے تھے' انسانی کاموں میں جو نقص فطری طور پر رہ جاتا ہے اس سے تو ان کے کام محفوظ نہ تھے۔ پھر آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ جس کو وہ صحیح قرار دیتے ہیں وہ حقیقت میں بھی صحیح ہے؟ صحت کا کامل یقین تو خود ان کو بھی نہ تھا۔ وہ بھی زیادہ سے زیادہ یہی کہتے تھے کہ اس حدیث کی صحت کا ظن غالب ہے مزید بر آں یہ ظن غالب ان کو جس بنا پر حاصل ہوتا تھا وہ بہ لحاظ روایت تھا نہ کہ بہ لحاظ درایت۔ ان کا نقطہ نظر زیادہ تر اخباری ہوتا تھا' فقہ ان کا اصل موضوع نہ تھا۔ اس لیے فقیہانہ نقطہ نظر سے احادیث کے متعلق رائے قائم کرنے میں وہ فقہاے مجتہدین کی بہ نسبت کمزور تھے۔ پس ان کے کمالات کا جائز اعتراف کرتے ہوئے

ہوئے یہ ماننا پڑے گا کہ احادیث کے متعلق جو کچھ بھی تحقیقات انہوں نے کی ہیں اس میں دو طرح کی کمزوریاں موجود ہیں۔ ایک بہ لحاظ اسناد اور دوسرے بہ لحاظ تفقہ۔

اس مطلب کی توضیح کے لیے ہم ان دونوں حیثیتوں کے نقائص پر تھوڑا سا کلام کریں گے۔

کسی روایت کے جانچنے میں سب سے پہلے جس چیز کی تحقیق کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ روایت جن لوگوں کے واسطے سے آئی ہے وہ کیسے لوگ ہیں۔ اس سلسلے میں متعدد حیثیات سے ایک ایک راوی کی جانچ کی جاتی ہے۔ وہ جھوٹا تو نہیں؟ روایتیں بیان کرنے میں غیر محتاط تو نہیں؟ فاسق اور بد عقیدہ تو نہیں؟ وہمی یا ضعیف الحفظ تو نہیں؟ مجہول الحال یا معروف الحال؟۔ ان تمام حیثیات سے رواۃ کے احوال کی جانچ پڑتال کر کے محدثین کرام نے اسماء الرجال کا عظیم الشان ذخیرہ فراہم کیا جو بلاشبہ نہایت بیش قیمت ہے۔ مگر ان میں کونسی چیز ہے جس میں غلطی کا احتمال نہ ہو؟ اول تو رواۃ کی سیرت' ان کے حافظے اور ان کی دوسری باطنی خصوصیات کے متعلق بالکل صحیح علم حاصل ہونا مشکل' دوسرے خود وہ لوگ جو ان کے متعلق رائے قائم کرنے والے تھے' انسانی کمزوریوں سے مبرا نہ تھے۔ نفس ہر ایک کے ساتھ لگا ہوا تھا اور اس بات کا قوی امکان تھا کہ اشخاص کے متعلق

اچھی یا بری رائے قائم کرنے میں ان کے ذاتی رجحانات کا بھی کسی حد تک دخل ہو جائے۔ یہ امکان محض امکان عقلی نہیں ہے' بلکہ اس امر کا ثبوت موجود ہے کہ بارہا یہ امکان فعل میں آگیا ہے۔ حماد جیسے بزرگ تمام علماے حجاز کے متعلق رائے ظاہر کرتے ہیں کہ "ان کے پاس علم نہیں' تمہارے بچے بھی ان سے زیادہ علم رکھتے ہیں۔" عطا' طاؤس اور مجاہد جیسے فضلاء کے حق میں ان کی یہی رائے ہے۔ یہ حماد کون ہیں؟ امام ابو حنیفہ کے استاد اور ابراہیم النخعی کے جانشین۔ امام زہری کو دیکھیے' اپنے زمانے کے اہل مکہ پر ریمارک کرتے ہیں **ما رایت انقض لعری الاسلام من اھل مکتہ** حالاں کہ مکہ اس وقت جلیل القدر علماء و صلحاء سے خالی نہ تھا۔ شعبی اور ابراہیم النخعی دونوں بڑے درجے کے لوگ ہیں۔ مگر ایک دوسرے پر کس طرح چوٹ کرتے ہیں۔ شعبی کہتے ہیں کہ "ابراہیم النخعی رات کو ہم سے مسائل پوچھتا ہے اور صبح لوگوں کے سامنے اپنی طرف سے بیان کرتا ہے" ابراہیم النخعی کہتے ہیں کہ "وہ کذاب مسروق سے روایت کرتا ہے حالاں کہ وہ مسروق سے ملا تک نہیں۔" ضحاک کو دیکھیے ایک مرتبہ اپنی بات کی پچ میں آکر صحابہ کرام کے متعلق کہہ گئے کہ "ہم ان سے زیادہ جانتے ہیں" سعید بن جبیر جیسے بزرگ ایک مسئلے میں شعبی پر جھوٹ کا الزام رکھتے ہیں اور عکرمہ کے حق میں

اپنے غلام سے کہتے ہیں کہ **لاتکذب علی کما کذب عکرمتہ علی ابن عباس**۔ امام مالک کی جلالت شان دیکھیے اور محمد بن اسحاق جیسے شخص کے حق میں ان کا یہ فرمانا دیکھیے کہ **ذالک دجال الدجالتہ**۔ اس سے بڑھ کر عجیب یہ کہ وہ تمام علمائے عراق پر سخت طعن کرتے ہیں اور ان کے حق میں فرماتے ہیں کہ **انزلوھم منزلتہ اھل الکتاب لاتصدقوھم ولا تکذبوھم**۔ امام ابوحنیفہ کس قدر جلیل القدر اور محتاط فقیہ ہیں، اعمش کے حق میں فرماتے ہیں کہ اس نے کبھی نہ رمضان کا روزہ رکھا نہ غسل جنابت کیا۔ وجہ صرف یہ تھی کہ اعمش "الماء من الماء" کے قائل تھے اور حذیفہ کی حدیث کے مطابق سحری کیا کرتے تھے۔ عبداللہ بن مبارک کس پایہ کے ثقہ بزرگ ہیں، ایک مرتبہ ان پر بھی ضد نے غلبہ کیا اور امام مالک کے حق میں ان کے منہ سے یہ الفاظ نکل گئے کہ "میں اس کو عالم نہیں سمجھتا" یحییٰ بن معین نے تو بڑے بڑے ثقات پر چوٹیں کی ہیں۔ زہری، اوزاعی، ابوعثمان النہدی، طاؤس۔ غرض اس عہد کے بڑے بڑے لوگوں پر وہ طعن کر گئے ہیں۔ حتیٰ کہ امام شافعی تک کے حق میں انہوں نے کہا کہ **لیس بثقتہ** ان سب سے بڑھ کر عجیب بات یہ ہے کہ بسا اوقات صحابہ رضی اللہ عنہم پر بھی بشری کمزوریوں کا غلبہ ہوجاتا تھا اور وہ ایک دوسرے پر چسوٹیں کرجاتے تھے۔ ابن عمرؓ نے سنا کہ ابوہریرہؓ وتر کو

ضروری نہیں سمجھتے۔ فرمانے لگے کہ ابو ہریرہؓ جھوٹے ہیں۔ حضرت عائشہؓ نے ایک موقع پر انس اور ابو سعید خدری رضی اللہ عنہما کے متعلق فرمایا کہ وہ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کو کیا جانیں' وہ تو اس زمانے میں بچے تھے۔ حضرت حسن بن علی سے ایک مرتبہ **شاہد و مشہود** کے معنی پوچھے گئے۔ انہوں نے اس کی تفسیر بیان کی۔ عرض کیا کہ ابن عمرؓ اور ابن زبیرؓ تو ایسا اور ایسا کہتے ہیں۔ فرمایا دونوں جھوٹے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک موقع پر مغیرہؓ بن شعبہ کو جھوٹا قرار دیا۔ عبادہ بن صامتؓ نے ایک مسئلہ بیان کرتے ہوئے مسعودؓ بن اوس انصاری پر جھوٹ کا الزام لگا دیا۔ حالاں کہ وہ بدری صحابہ میں سے ہیں۔۔ ؎

اس قسم کی مثالیں پیش کرنے سے ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ اسماء الرجال کا سارا علم غلط ہے' بل کہ ہمارا مقصد صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ جن حضرات نے رجال کی جرح و تعدیل کی ہے وہ بھی تو آخر انسان تھے' بشری کمزوریاں ان کے ساتھ بھی لگی ہوئی تھیں۔ کیا

؎ یہ تمام مثالیں علامہ ابن عبد البر کی کتاب جامع بیان العلم سے ماخوذ ہیں۔

ضرور ہے کہ جس کو انہوں نے ثقہ قرار دیا ہو وہ بالیقین ثقہ اور تمام روایتوں میں ثقہ ہو' اور جس کو انہوں نے غیر ثقہ ٹھیرایا ہو وہ بالیقین غیر ثقہ ہو اور اس کی تمام روایتیں پایہ اعتبار سے ساقط ہوں۔ پھر ایک ایک راوی کے حافظے اور اس کی نیک نیتی اور صحت ضبط وغیرہ کا حال بالکل صحیح معلوم کرنا تو اور بھی مشکل ہے' اور ان سب سے زیادہ مشکل یہ تحقیق کرنا ہے کہ ہر راوی نے ہر روایت کے بیان میں ان تمام جزئیات متعلقہ کو ملحوظ بھی رکھا ہے یا نہیں جو فقیہانہ نقطہ نظر سے استنباط مسائل میں اہمیت رکھتی ہیں۔

یہ تو فن رجال کا معاملہ ہے' اس کے بعد دوسری اہم چیز سلسلہ اسناد ہے محدثین نے ایک ایک حدیث کے متعلق یہ تحقیق کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہر راوی جس شخص سے روایت لیتا ہے آیا وہ اس کا ہم عصر تھا یا نہیں' ہم عصر تھا تو اس سے ملا بھی تھا یا نہیں اور ملا تھا تو آیا اس نے یہ خاص حدیث خود اسی سے سنی یا کسی اور سے سن لی اور اس کا حوالہ نہیں دیا۔ ان سب چیزوں کی تحقیق انہوں نے اسی حد تک کی ہے جس حد تک انسان کر سکتے تھے' مگر لازم نہیں کہ ہر روایت کی تحقیق میں یہ سب امور ان کو ٹھیک ٹھیک ہی معلوم ہو گئے ہوں۔ بہت ممکن ہے کہ جس روایت کو وہ متصل السند قرار دے رہے ہیں' وہ در حقیقت منقطع ہو اور انہیں یہ معلوم نہ ہو سکا کہ

بیچ میں کوئی ایسا مجہول الحال راوی چھوٹ گیا ہے جو ثقہ نہ تھا' اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ جو روایتیں مرسل یا معضل یا منقطع ہیں' اور اس بنا پر پایہ اعتبار سے گری ہوئی سمجھی جاتی ہیں' ان میں سے بعض ثقہ راویوں سے آئی ہوں اور بالکل صحیح ہوں۔

یہ اور ایسے ہی بہت سے امور ہیں جن کی بنا پر اسناد اور جرح و تعدیل کے علم کو کلیتہ " صحیح نہیں سمجھا جاسکتا۔ یہ مواد اس حد تک قابل اعتماد ضرور ہے کہ سنت نبوی اور آثار صحابہ کی تحقیق میں اس سے مدد لی جائے اور اس کا مناسب لحاظ کیا جائے' مگر اس قابل نہیں ہے کہ بالکل اسی پر اعتماد کرلیا جائے۔

جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا' محدثین رحمہم اللہ کا خاص موضوع اخبار و آثار کی تحقیق بہ لحاظ روایت کرنا تھا' اس لیے ان پر اخباری نقطہ نظر غالب ہو گیا تھا' اور وہ روایات کو معتبر یا غیر معتبر قرار دینے میں زیادہ تر صرف اسی چیز کا لحاظ فرماتے تھے کہ اسناد اور رجال کے لحاظ سے وہ کیسی ہیں' رہا فقیہانہ نقطہ نظر (یعنی متن حدیث پر غور کرکے یہ رائے قائم کرنا کہ وہ قابل قبول ہے یا نہیں) تو وہ ان کے موضوع خاص سے ایک حد تک غیر متعلق تھا' اس لیے اکثر وہ ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا تھا اور وہ روایات پر اس حیثیت سے کم ہی نگاہ ڈالتے تھے' اسی وجہ سے اکثر ہوا ہے کہ ایک روایت کو انہوں

نے صحیح قرار دیا ہے حالاں کہ معنی کے اعتبار سے وہ زیادہ اعتبار کے قابل نہیں ہے اور ایک دوسری روایت کو وہ قلیل الاعتبار قرار دے گئے ہیں حالاں کہ معنی وہ صحیح معلوم ہوتی ہے یہاں اس کا موقع نہیں کہ مثالیں دے کر تفصیل کے ساتھ اس پہلو کی توضیح کی جائے مگر جو لوگ امور شریعت میں نظر رکھتے ہیں ان سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ محدثانہ نقطہ نظر بکثرت مواقع پر فقیہانہ نقطہ نظر سے ٹکرا گیا ہے اور محدثین کرام صحیح احادیث سے بھی احکام و مسائل کے استنباط میں وہ توازن و اعتدال ملحوظ نہیں رکھ سکے ہیں جو فقہائے مجتہدین نے رکھا ہے۔

اس بحث سے یہ بات معلوم ہو گئی کہ جس طرح حدیث کو بالکلیہ رد کر دینے والے غلطی پر ہیں' اسی طرح وہ لوگ بھی غلطی سے محفوظ نہیں ہیں' جنہوں نے حدیث سے استفادہ کرنے میں صرف روایات ہی پر اعتماد کر لیا ہے' مسلک حق ان دونوں کے درمیان ہے اور یہ وہی مسلک ہے جو ائمہ مجتہدین نے اختیار کیا ہے۔ امام ابوحنیفہ کی فقہ میں آپ بکثرت ایسے مسائل دیکھتے ہیں جو مرسل' معضل اور منقطع احادیث پر مبنی ہیں یا جن میں ایک قوی الاسناد حدیث کو چھوڑ کر ایک ضعیف الاسناد حدیث کو قبول کیا گیا ہے' یا جن میں احادیث کچھ کہتی ہیں اور امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کچھ

کہتے ہیں۔ یہی حال امام مالک کا ہے باوجود یہ کہ اخباری نقطہ نظر ان پر زیادہ غالب ہے مگر پھر بھی ان کے تفقہ نے بہت سے مسائل میں ان کو ایسی احادیث کے خلاف فتوی دینے پر مجبور کردیا جنہیں محدثین صحیح قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ لیث بن سعد نے ان کی فقہ سے تقریباً ۷۰ مسئلے اس نوعیت کے نکالے ہیں' امام شافعی کا حال بھی اس سے کچھ بہت زیادہ مختلف نہیں۔ معاذ اللہ اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ یہ لوگ کسی حدیث کو صحیح جان کر اس سے انحراف کرتے تھے نہیں بلکہ اصل معاملہ یہ تھا کہ ان کے نزدیک صحت حدیث کا مدار صرف اسناد پر نہ تھا' بلکہ اسناد کے علاوہ ایک اور کسوٹی بھی تھی جس پر وہ احادیث کو پرکھتے تھے' اور جس حدیث کے متعلق ان کو اطمینان ہوجاتا تھا کہ یہ حقیقت سے اقرب ہے۔ اسی کو قبول کرلیتے تھے خواہ وہ خالص محدثانہ نقطہ نظر سے مرجوح ہی کیوں نہ ہو۔

یہ دوسری کسوٹی کون سی ہے؟ ہم اس سے پہلے بھی اشارۃً اس کا ذکر کئی مرتبہ کرچکے ہیں۔ جس شخص کو اللہ تعالیٰ تفقہ کی نعمت سے سرفراز فرماتا ہے' اس کے اندر قرآن اور سیرت رسولؐ کے غائر مطالعہ سے ایک خاص ذوق پیدا ہوجاتا ہے' جس کی کیفیت بالکل ایسی ہے جیسے ایک پرانے جوہری کی بصیرت کہ وہ جواہر کی نازک سے نازک خصوصیات تک کو پرکھ لیتی ہے اس کی نظر بہ حیثیت مجموعی

شریعت حقہ کے پورے سسٹم پر ہوتی ہے اور وہ اس سسٹم کی طبیعت کو پہچان جاتا ہے' اس کے بعد جب جزئیات اس کے سامنے آتے ہیں تو اس کا ذوق اسے بتا دیتا ہے کہ کون سی چیز اسلام کے مزاج اور اس کی طبیعت سے مناسبت رکھتی ہے اور کون سی نہیں رکھتی۔ روایات پر جب وہ نظر ڈالتا ہے تو ان میں بھی یہی کسوٹی رد و قبول کا معیار بن جاتی ہے۔ اسلام کا مزاج عین ذات نبویؐ کا مزاج ہے۔ جو شخص اسلام کے مزاج کو سمجھتا ہے اور جس نے کثرت کے ساتھ کتاب اللہ و سنت رسولؐ اللہ کا گہرا مطالعہ کیا ہوتا ہے وہ نبی کریمؐ کا ایسا مزاج شناس ہو جاتا ہے کہ روایات کو دیکھ کر خود بخود اس کی بصیرت اسے بتا دیتی ہے کہ ان میں سے کون سا فعل میرے سرکار کا ہو سکتا ہے اور کون سی چیز سنت نبویؐ سے اقرب ہے' یہی نہیں بلکہ جن مسائل میں ان کو قرآن و سنت سے کوئی چیز نہیں ملتی ان میں بھی وہ کہہ سکتا ہے کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے فلاں مسئلہ پیش آتا تو آپؐ اس کا فیصلہ یوں فرماتے یہ اس لیے کہ اس کی روح روح محمدیؐ میں گم اور اس کی نظر بصیرت نبویؐ کے ساتھ متحد ہو جاتی ہے۔ اس کا دماغ اسلام کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے اور وہ اسی طرح دیکھتا اور سوچتا ہے جس طرح اسلام چاہتا ہے کہ دیکھا اور سوچا جائے' اس مقام پر پہنچ جانے کے بعد انسان اسناد کا بہت زیادہ محتاج نہیں رہتا۔ وہ اسناد

سے مدد ضرور لیتا ہے مگر اس کے فیصلے کا مدار اس پر نہیں ہوتا۔ وہ بسا اوقات ایک غریب، ضعیف، منقطع السند، مطعون فیہ حدیث کو بھی لے لیتا ہے، اس لیے کہ اس کی نظر اس افتادہ پتھر کے اندر ہیرے کی جوت دیکھ لیتی ہے اور بسا اوقات وہ ایک غیر معلل، غیر شاذ، متصل السند، مقبول حدیث سے بھی اعراض کر جاتا ہے، اس لیے کہ اس جام زریں میں جو بادۂ معنی بھری ہوئی ہے وہ اسے طبیعت اسلام اور مزاج نبویؐ کے مناسب نظر نہیں آتی۔

یہ چیز چوں کہ سراسر ذوقی ہے اور کسی ضابطے کے تحت نہیں آتی، نہ آسکتی ہے، اس لیے اس میں اختلاف کی گنجائش پہلے بھی تھی اور اب بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گی۔ چناں چہ اسی وجہ سے ائمہ مجتہدین کے درمیان جزئیات میں بکثرت اختلافات ہوئے ہیں پھر یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ ایک شخص کا ذوق لامحالہ دوسرے شخص کے ذوق سے کلیتہً مطابق ہی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ہی مسلک کے ائمہ نے بہت سے مسائل میں ایک دوسرے سے اختلاف کیا ہے امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب کے اقوال میں جو اختلافات پائے جاتے ہیں وہ اس کی ایک روشن مثال ہیں۔ پھر بھی یہ ضروری نہیں کہ ہر مجتہد کا ذوق ہر مسئلے میں صواب ہی کو پہنچ جائے۔ انسان بہرحال کمزوریوں کا مجموعہ ہے اعلیٰ سے اعلیٰ درجے کا مجتہد بھی غلطی

کرسکتا ہے اور کرجاتا ہے اسی بنا پر ائمہ مجتہدین ہمیشہ ڈرتے رہے ہیں اور انہوں نے ہمیشہ اپنے متبعین کو ہدایت کی ہے کہ ہم پر بالکل اعتماد نہ کرلو' خود بھی تحقیق کرتے رہو اور جب کوئی سنت ہمارے قول کے خلاف ثابت ہو جائے تو ہمارے قول کو رد کرکے سنت کی پیروی کرو۔ امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ **لایحل لاحد ان یقول مقالتنا حتی یعلم من این قلنا** (کسی شخص کے لیے جائز نہیں کہ ہمارے قول پر فتویٰ دے جب تک کہ وہ تحقیق نہ کرلے کہ ہمارے قول کا ماخذ کیا ہے۔) امام زفر کا قول ہے **انما ناخذ بالرای مالم نجد الاثر فاذا جاء الاثر ترکنا الرای و اخذنا بالاثر** (جب ہم کو کوئی حدیث نہیں ملتی تو ہم اپنی رائے سے فیصلہ کرتے ہیں جب حدیث مل جاتی ہے تو رائے کو چھوڑ کر حدیث کو لے لیتے ہیں۔) امام مالک کا ارشاد ہے **انما انا بشر اخطی و اصیب فانظروا فی رای فکلما وافق الکتاب والسنتہ فخذوہ و کلما لم یوافق الکتاب والسنتہ فاترکوہ** (میں ایک انسان ہوں' غلطی بھی کرتا ہوں اور صحیح رائے بھی قائم کرتا ہوں۔ لہٰذا تم میری رائے کو نظر تحقیق سے دیکھو۔ جو کچھ کتاب و سنت کے مطابق ہو اسے لے لو اور جو اس کے خلاف ہو اسے رد کردو۔) امام شافعی کا بیان ہے کہ **اذا صح الحدیث فاضربوا بقولی الحائط** (جب حدیث صحیح تمہیں مل جائے تو میرے قول کو دیوار پر

دے مارو۔) اور **لاقول لاحد مع سنتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم** (سنت رسول کے مقابلے میں کسی کو کچھ کہنے کا حق نہیں۔) غرض یہ کہ تمام ائمہ بالاجماع کہتے ہیں کہ جس شخص پر کسی مسئلے میں سنت رسولؐ روشن ہوجائے اس کے لیے پھر کسی دوسرے شخص کا قول لینا حرام ہے خواہ وہ کیسے ہی بڑے مرتبہ کا شخص ہو۔

(ترجمان القرآن صفر۵٦ھ مئی ۳۷ء)

استدراک

اس مضمون کی اشاعت کے بعد اہل حدیث حضرات کی طرف سے اس پر جو اعتراضات ہوئے ہیں اور ان پر میری طرف سے جو جوابات دیے گئے ہیں ان کو یہاں نقل کردینا فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔

ایک اہل حدیث دوست کے سوالات :

(الف) مسلمانوں کا چاروں فقہوں کا ماننا کس نص کے ماتحت ہے؟

(ب) اسناد حدیث اور تفقہ مجتہدین میں سے کس کو کس پر فضیلت ہے؟

(ج) تفقہ مجتہد اور اسناد حدیث میں سے کس میں زیادہ ظنیت ہے؟

(د) محدث اور فقیہ ایک ہی آدمی ہوسکتا ہے یا نہیں۔ اور اسے نرے محدث یا نرے فقیہ پر فضیلت ہے یا نہیں؟

(ر) کوئی نظیر بتائیں کہ امام ابوحنیفہ نے متن کو ملحوظ رکھ کر ضعیف

الاسناد حدیث کو قبول کیا اور راو ر قوی الاسناد حدیث کو چھوڑا ہو۔
(س) کیا یہ قول ائمہ کہ ان کے فیصلوں کے مقابلہ میں قوی الاسناد حدیث ہی قابل قبول ہے صحیح ہے؟
(ص) درایت کا معیار کیا ہے کہ اسے سامنے رکھ کر اسناد صحیحہ رکھنے کے باوجود حدیث قوی الاسناد کو رد کر دیا جائے؟ نیز بتایا جائے کہ کس نص نے یہ شرط درایت اور اس کا معیار قائم کیا ہے؟
(ط) کیا کسی مسلمان کو یہ حق ہے کہ خدا اور رسولؐ کا حکم ظن غالب کے بموجب اسے پہنچے اور اس میں درایت کی مداخلت کر کے اس سے گریز کرے اور اپنے تفقہ کی بنا پر اس کی مخالفت کرے، جب کہ اس کے تفقہ میں بھی خطا کا امکان ہے؟

جواب : **الف**۔ چاروں فقہوں کو برحق ماننا کسی نص کے ماتحت نہیں ہے۔ بلکہ اس بنا پر ہے کہ یہ چار فقہی مذاہب کتاب و سنت سے استنباط کرنے کے ان اصولوں کو اختیار کرتے ہیں جن کے لیے شریعت میں گنجائش اور بنیاد موجود ہے، چاہے جزئی امور میں ان کے درمیان کتنا ہی اختلاف ہو اور جزئی امور میں ان سے اختلاف کرنے کے لیے کتنے ہی معقول وجوہ موجود ہوں، لیکن اصولاً" استنباط احکام کے وہی طریقے ان مذاہب میں استعمال کیے گئے ہیں جو کتاب و سنت سے ثابت ہیں اور جن سے خود صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین

نے استنباط مسائل میں کام لیا تھا۔

ب۔ اسناد حدیث اور تفقہ مجتہد میں سے کسی کو کسی پر مطلقاً تفوق نہیں دیا جاسکتا۔ اسناد حدیث اس بات کی ایک شہادت ہے کہ جو روایت نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم کو پہنچ رہی ہے' وہ کہاں تک قابل اعتبار ہے اور تفقہ مجتہد ایک ایسے شخص کی تحقیقی رائے (Research) ہے جو کتاب و سنت میں گہری بصیرت رکھنے کے بعد ایک رپورٹ کے متعلق اندازہ کرتا ہے کہ وہ کہاں تک قابل قبول ہے اور کہاں تک نہیں یا اس رپورٹ سے جو معنی اخذ ہوتے ہیں وہ نظام شریعت میں کہاں تک نصب (Fit) ہوسکتے ہیں اور کہاں تک غیرمتناسب (Unfit) ثابت ہوتے ہیں۔ یہ دونوں چیزیں اپنی اپنی الگ الگ حیثیت رکھتی ہیں۔ جس طرح عدالت میں شہادتیں اور جج کا فیصلہ' دونوں کی الگ حیثیت ہے یعنی نہ مطلقاً یہ کہا جاسکتا ہے کہ جج کا فیصلہ شہادتوں پر بہرحال مقدم ہے اور نہ یہی کہا جاسکتا ہے کہ شہادتیں ضرور جج کے فیصلے پر مقدم ہوتی ہیں۔ اسی طرح محدث کی شہادت اور فقیہ کی اجتہادی تحقیق' دونوں میں سے کسی کو بھی مطلقاً دوسرے پر ترجیح نہیں دی جاسکتی۔

ج۔ تفقہ مجتہد میں بھی خطا کا امکان ہے اور اسناد حدیث میں بھی۔ پس میرے نزدیک لازم ہے کہ ایک ذی علم آدمی مجتہدین کے اجتہاد

اور احادیث کی روایات دونوں میں نظر کرکے حکم شرعی کی تحقیق کرے۔ رہے وہ لوگ جو حکم شرعی کی خود تحقیق نہیں کرسکتے تو ان کے لیے یہ بھی صحیح ہے کہ کسی عالم کے اوپر اعتماد کریں اور یہ بھی صحیح ہے کہ جو مستند حدیث مل جائے اس پر عمل کریں۔

د۔ ایک آدمی بیک وقت محدث اور فقیہ ہوسکتا ہے اور ایسا شخص نرے محدث یا نرے فقیہ کے مقابلے میں اصولاً" قابل ترجیح ہے۔ لیکن میرا جواب صرف اصولی حیثیت سے ہے، کسی شخص خاص پر اس کا انطباق کرنے میں لازماً" یہ دیکھنا پڑے گا کہ آیا تفقہ میں اس کا وہی مرتبہ ہے جو حفظ حدیث میں ہے۔

ر۔ اس وقت میرے پیش نظر مطلوبہ نظیر نہیں ہے اور ویسے بھی نظیریں پیش کرنے سے بحث کا سلسلہ دراز ہوتا ہے۔

س۔ ائمہ مجتہدین نے جو کچھ فرمایا ہے وہ بالکل صحیح ہے اور میں بھی اسی کا قائل ہوں۔ لیکن میں نے جو کچھ لکھا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ بسااوقات صحیح الاسناد حدیث متن کے اعتبار سے کمزور پہلو رکھتی ہے اور کتاب و سنت سے جو دوسری معلومات ہم کو حاصل ہوتی ہیں ان کے ساتھ اس کا متن مطابقت نہیں رکھتا۔ ایسے حالات میں ناگزیر ہوجاتا ہے کہ یا اس حدیث کی تاویل کی جائے اور یا اسے رد کیا جائے۔

س۔ درایت سے مراد فہم دین ہے جس کو قرآن مجید میں "حکمت" سے تعبیر کیا گیا ہے اور یہ حکمت شریعت کی صحیح پیروی کے لیے وہی درجہ رکھتی ہے جو درجہ "حذاقت" کا فن طب میں ہے۔ جن لوگوں نے اس میں سے کم حصہ پایا ہو یا جنہیں اس کی قدر و قیمت کا احساس ہی نہ ہو ان کے لیے تو یہی مناسب ہے کہ جیسا لکھا پائیں ویسا ہی عمل کریں۔ لیکن جنہیں اس میں سے کچھ حصہ ملا ہو وہ اگر اس بصیرت سے' جو انہیں اللہ کے فضل سے کتاب و سنت میں حاصل ہوئی ہو' کام نہ لیں تو میرے نزدیک گنہ گار ہوں گے۔

میرے نزدیک کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے جس سے میں آپ کو حکمت اور فقہ اور فہم دین کا کوئی ایسا معیار بتا سکوں جس پر آپ ناپ تول کر دیکھ لیں کہ کسی نے ان میں سے حصہ پایا ہے یا نہیں اور پایا ہے تو کتنا پایا ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے طبیب کی حذاقت کا' جوہری کی جوہر شناسی کا اور کسی صاحب فن کی فنی مہارت کا کوئی نپا تلا معیار نہیں قائم کیا جا سکتا۔ مگر اس چیز کے حدود معین نہ کیے جا سکنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ چیز سرے سے لاشے ہے یا شریعت میں اس کا کوئی مقام نہیں ہے۔

ط۔ اس سوال کا جواب اوپر کے جوابات میں ضم ہے۔ صرف اتنا اور کہہ سکتا ہوں کہ بلاشبہ درایت کے استعمال میں خطا کا امکان ہے'

لیکن ایسا ہی امکان کسی حدیث کو صحیح، کسی کو ضعیف اور کسی کو موضوع قرار دینے میں بھی ہے۔ اگر کوئی مسلمان درایت کے استعمال میں غلطی کر کے مجرم ہو جاتا ہے تو وہ احادیث کے مرتبہ کا تعین کرنے میں بھی غلطی کر کے ویسا ہی مجرم ہو گا۔ لیکن شریعت انسان کی استعداد اور اس کے ممکنات کی حد تک ہی اس پر بار ڈالتی ہے اور اسی حد تک اسے مسئول قرار دیتی ہے۔

ایک دوسرے اہل حدیث دوست کا عنایت نامہ:۔

"فقہی جزئیات کی تعمیل میں کتاب و سنت کے ماتحت مختلف ہونا الگ معاملہ ہے اور اسے برداشت کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اصولی طور پر روایت نبویؐ اور درایت مجتہد کو مساویانہ حیثیت دے دینا ناقابل برداشت ہے، بلکہ بعض حالات میں یہ معاملہ انکار حدیث کا مترادف، ہو سکتا ہے۔ خود اکابر حنفیہ بھی اس کے قائل نہیں ہیں۔ نیز امام ابو حنیفہ نے بھی اس قسم کے عقیدہ و خیال سے تبری اور بیزاری ظاہر کی ہے، تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو حجۃ اللہ البالغہ اور شامی۔"

جواب :۔ آپ کا یہ فقرہ کہ "اصولی طور پر روایت نبویؐ اور درایت مجتہد کو مساویانہ حیثیت دے دینا" یقیناً میرے مسلک کی صحیح ترجمانی نہیں ہے اور پھر آپ کا یہ ارشاد کہ "بعض حالات میں یہ معاملہ انکار حدیث کا مترادف ہو سکتا ہے" بے انصافی کی حد تک

جا پہنچتا ہے۔ آپ خود ہی انصاف سے غور فرمائیں کہ اسی کتاب میں حدیث کے متعلق میں نے جو مضامین لکھے ہیں اور دوسری کتابوں اور مضامین میں جس طرح میں حدیث سے استدلال و احتجاج کرتا رہا ہوں' کیا ان سب چیزوں کو دیکھنے کے بعد میرے متعلق یہ شبہ کرنے کی کوئی گنجائش نکل سکتی ہے کہ میرا ذرہ برابر بھی کوئی میلان منکرین حدیث کے مسلک کی طرف ہے یا ہو سکتا ہے؟ پھر اگر آپ مجھے مومن و مسلم سمجھتے ہیں تو آخر کس طرح آپ نے یہ گمان کرلیا کہ میں کسی روایت کو فی الحقیقت حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم مان لینے کے بعد پھر اس پر کسی کے تفقہ یا اپنے اجتہاد یا کسی امام کے قول کو ترجیح دے سکتا ہوں؟ ترجیح تو درکنار اگر میں دونوں کو مساوی بھی سمجھوں' بلکہ اس کا خیال بھی کروں تو مومن کیسے رہ جاؤں گا؟

دراصل آپ لوگ جس غلط فہمی میں مبتلا ہیں وہ یہی ہے کہ آپ سمجھتے ہیں کہ ہم اجتہاد و تفقہ کو حدیث رسولؐ پر ترجیح دیتے ہیں یا دونوں کو ہم پلہ قرار دیتے ہیں۔ حالاں کہ اصل واقعہ یہ نہیں ہے۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ کوئی روایت جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہو' اس کی نسبت کا صحیح و معتبر ہونا بجائے خود زیر بحث ہوتا ہے۔ آپ کے نزدیک ہر اس روایت کو حدیث رسولؐ مان لینا ضروری ہے جسے محدثین سند کے اعتبار سے صحیح قرار دیں۔ لیکن

ہمارے نزدیک یہ ضروری نہیں ہے۔ ہم سند کی صحت کو حدیث کے صحیح ہونے کی لازمی دلیل نہیں سمجھتے۔ ہمارے، نزدیک اسناد کی صحت حدیث کی صحت معلوم کرنے کا ایک ہی ذریعہ نہیں ہے' بلکہ وہ ان ذرائع میں سے ایک ہے جن سے کسی روایت کے حدیث رسولؐ ہونے کا ظن غالب حاصل ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہم متن پر غور کرنا' قرآن و حدیث کے مجموعی علم سے دین کا جو فہم ہمیں حاصل ہوا ہے' اس کا لحاظ کرنا اور حدیث کی وہ مخصوص روایت جس معاملہ سے متعلق ہے اس معاملہ میں قوی تر ذرائع سے جو سنت ثابتہ ہمیں معلوم ہو اس پر نظرڈالنا بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ علاوہ بریں اور بھی متعدد پہلو ہیں جن کا لحاظ کیے بغیر ہم کسی حدیث کی نسبت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کردینا درست نہیں سمجھتے۔ پس ہمارے اور آپ کے درمیان اختلاف اس امر میں نہیں ہے کہ حدیث رسولؐ اور اجتہاد مجتہد میں مساوات ہے یا نہیں' بل کہ اختلاف دراصل اس امر میں ہے کہ روایات کے ردو قبول اور ان سے احکام کے استنباط میں ایک محدث کی رائے بہ لحاظ سند اور ایک مجتہد کی رائے بہ لحاظ درایت کا مرتبہ مساوی ہے نہیں؟ یا یہ کہ دونوں میں سے کس کی رائے زیادہ وزنی ہے؟ اس باب میں اگر کوئی شخص دونوں کو ہم پلہ قرار دیتا ہے تب بھی کسی گناہ کا ارتکاب نہیں کرتا اور اگر دونوں میں سے کسی

ایک کو دوسرے پر ترجیح دیتا ہے تب بھی کسی گناہ کا ارتکاب نہیں کرتا۔ لیکن آپ لوگ اس کو گنہ گار بنانے کے لیے اس پر خواہ مخواہ یہ الزام عائد کرتے ہیں کہ وہ حدیث کو حدیث رسولؐ مان لینے کے بعد پھر کسی مجتہد کی رائے کو اس کا ہم پلہ یا اس پر قابل ترجیح قرار دیتا ہے۔ حالاں کہ اس چیز کا تصور بھی کسی مومن کے قلب میں جگہ نہیں پا سکتا۔

محدثین جن بنیادوں پر احادیث کے صحیح یا غلط یا ضعیف وغیرہ ہونے کا فیصلہ کرتے ہیں ان کے اندر کمزوری کے مختلف پہلو میں بیان کر چکا ہوں۔ آپ براہ کرم مجھے بتائیے کہ فی الواقع کمزوری کے وہ پہلو فن حدیث میں موجود ہیں یا نہیں؟ اگر موجود ہیں تو پھر آخر آپ حضرات ہم سے محدثین کی آراء پر ایمان لے آنے کا مطالبہ کیوں اس شدومد سے کرتے ہیں؟ محدثین کو بالکل ناقابل اعتبار تو ہم نے کہا نہیں، نہ کبھی ہم اس کا خیال بھی دل میں لا سکتے ہیں، بلکہ اس کے برعکس حدیث کی تحقیق میں سب سے پہلے ہم یہی دیکھنا ضروری سمجھتے ہیں کہ سند کے اعتبار سے اس کا کیا حال ہے اور اس معاملہ میں جس پائے کے محدث نے اس کو اپنی کتاب میں جگہ دی ہو اس کے مرتبہ کے لحاظ سے ہم اس کی رائے کو پوری پوری وقعت دیتے ہیں۔ لیکن فن حدیث کی ان کمزوریوں کی بنا پر، جن کا ذکر کیا ہے، ہم اس امر کا التزام نہیں کر سکتے کہ محض علم روایت کی بہم پہنچائی ہوئی معلومات ہی پر پورا پورا اعتماد کر لیں اور ہر اس حدیث کو ضرور ہی حدیث رسولؐ تسلیم کر لیں جسے اس علم کی رو سے صحیح قرار دیا گیا ہو۔ آپ ہماری اس رائے سے اتفاق نہ کریں جس طرح ہم آپ کی اس رائے سے اتفاق نہیں کرتے لیکن اس اختلاف رائے کا نتیجہ یہ تو نہ ہونا چاہیے کہ آپ ہم پر اس جرم کا الزام لگائیں جو فی الواقع ہم نے نہیں کیا ہے۔